ڈاکٹر رخسانہ بلوچ* پروفیسر ڈاکٹر یوسف خشک**

راشد ؔ بدلتا سماج اور عصری تناظر

Abstract: *The two world wars not only changed geography of the world but also brought about also revolutionized social structure .Before entering 21st century, the corporate culture started engulfing others cultures of the world. Be social changes world depicted in the poetry of N.M .Rashid with the futuristic approach. In this article, the socials changes have been discussed from the perspective of N.M.Rashid.*

بیسویں صدی کا ابتدائی دور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر بھی کشمکش اور تبدیلی کا دور تھا۔ برطانوی سامراج نے اپنے قیام کی نصف صدی مکمل کر لی تھی۔ نئے سیاسی و معاشی نظام کے منفی و مثبت نتائج ظہور پذیر ہونے لگے، جس نے سماج کو صدیوں پرانے جمود سے نکال کر حرکت اور ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ پرانے طبقات اپنی اہمیت کھو چکے تھے اور نئے طبقے وجود میں آ چکے تھے جس نے سماج کو طبقاتی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں مغرب کی صنعتی اشیا کے تعارف اور دیسی صنعتوں کی تباہی نیز نئے زرعی نظام کی وجہ سے زمین ہی آمدنی کا واحد ذریعہ بن کر رہ گئی تھی جس پر قدرت پانے کی خواہش نے زمین دار اور کسان کے درمیان تصادم و کشمکش کے نئے محاذ قائم کر دیے تھے۔ صدیوں سے استحصال کی بنیادوں پر قائم ہندوستانی سماج برطانوی سامراج کا سہارا پا کر مزید طاقتور ہو گیا تھا جس کے خلاف شعور کی بیداری نے ایسی اصلاحی اور سیاسی تحریکوں کو جنم دیا تھا کہ عوام تحریک آزادی کے پرچم تلے متحد ہونے لگے تھے اور مزدور اور کسان کی اہمیت کو تسلیم کیا جانے لگا تھا۔(۱)

آمدورفت کے نئے وسائل ریل، رابطہ کے وسائل، ڈاک و تار اور اخبارات نے ہندوستان میں ایک وسیع تر سماج اور ایک وسیع تر تہذیب کے تصور کو اس طرح فروغ دیا تھا کہ فکر و عمل کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ سائنسی علوم کی تعلیم، مغربی ادب کے اثرات کی وجہ سے جہاں پُرانے افکار واقدار فرسودہ قرار پائے تھے وہاں نئے خیالات و تصورات زندگی میں جگہ پانے لگے تھے جس نے سماج کو جدید و قدیم کی کشمکش میں مبتلا کر دیا تھا۔ ادب میں غور و فکر کے انداز اور اظہار کے سانچے بدلنے لگے تھے۔ شاعری میں نئے تجربات کیے جانے لگے ۔ یہ تجربات نہ صرف ہیئت کی شکل میں تھے بلکہ اس میں سماجی اقدار میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی موضوع سخن بنایا جانے لگا، ان تجربات میں تبدیلی کے علم برداروں میں ایک بڑا نام ن۔م۔راشد کا ہے۔

* اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہء اُردو، گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد
** پرو وائس چانسلر، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیرپور

انسان(سانیٹ)

الٰہی تیری دنیا جس میں ہم انسان رہتے ہیں
غریبوں، جاہلوں، مُردوں کی، بیماروں کی دنیا ہے
یہ دنیا بے کسوں کی اور لاچاروں کی دنیا ہے
ہم اپنی بے بسی پر رات دن حیران رہتے ہیں!
ہماری زندگی اک داستاں ہے ناتوانی کی
بنالی اے خدا اپنے لیے تقدیر بھی تُو نے
اور انسانوں سے لے لی جرأت تدبیر بھی تُو نے
یہ داد اچھی ملی ہے ہم کو اپنی بے زبانی کی!
اسی غوروتجسس میں ک ئی راتیں گزری ہیں
میں اکثر چیخ اُٹھتا ہوں بنی آدم کی ذلت پر
جنوں سا ہوگیا ہے مجھ کو احساسِ بضاعت پر
ہماری بھی نہیں افسوس، جو چیزیں"ہماری" ہیں!
کسی سے دور یہ اندوہِ پنہاں ہو نہیں سکتا!
خدا سے بھی علاجِ دردِ انسان ہو نہیں سکتا!(۲)

عام طور پر ان ملکوں کو کم ترقی یافتہ کہا جاتا ہے جن کا معیار زندگی کم ہو، جن کی معیشت کا انحصار زراعت پر ہو اور جہاں صنعت و حرفت بہت کم ہو۔ ایسے ملکوں میں ترقی کے معلوم راستوں میں بہت سی رکاوٹیں ہوتی ہیں، مثلاً سرمائے کی قلت، ماہر کارکنوں کی کم یابی، پیداوار کی ناہمواری، زراعتی نظام کی فرسودگی، ملک گیر غریبی، موئثر طلب کی کمی کی وجہ سے روزگار تلاش کرنے والوں کی افراط۔ مختصر یہ کہ سرمائے کی قلت، محنت اور انتظامی مہارت کی کمی اور تنظیم ایسی معیشت کے کم زور ترین پہلو ہیں۔ برطانوی ہندوستان میں پیداآوری کمی کے ذمہ دار یہی بنیادی عناصر ہیں۔

ایک طرف زراعتی نظام کی فرسودگی کی وجہ سے پیداآوری کم زور، پیداوار کم اور کھیتوں پر آبادی کی افراط ہوتی ہے اور ان سے

زیادہ سے زیادہ نچوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے، دوسری طرف صنعت نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے جس کا سبب صنعتی مشینوں اور آلات کی قلت، ٹیکنیکل عملے کی کم یابی اور ایسے مہم جو لوگوں کا فقدان ہوتا ہے جو سرمایہ لگا کر جوکھم مول لینے پر آمادہ ہوں۔ اس کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی کمی اور وسائل کا پورا نہ ہونا دونوں باتیں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ مثلاً برطانوی ہند میں مادی اور انسانی دونوں وسائل کا پورا استعمال نہیں تھا جس کا ہندوستان کی معیشت پر گہرا اثر پڑا۔ اس کے باوجود کہ زمین پر آبادی کا دباؤ بہت زیادہ تھا۔ کھیت ان معنوں میں پورے استعمال نہیں ہوتے تھے کہ ان کی پیداوار فی فصل اور فی ایکڑ بہت کم تھی۔ اس کا سبب پانی، کھاد، اچھے بیج کی کمی، کھیتی کے طریقوں کی خرابی اور زمین کی روز بہ روز گھٹتی ہوئی زرخیزی تھی۔ ہندوستانی زراعت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ ظاہری روزگار میں بے روزگاری مضمر تھی۔ یعنی ایک معمولی کسان اگر دو فصلیں نہیں اگاتا تھا تو سال کے صرف پانچ چھ مہینے باکار رہتا تھا اور باقی حصے میں بے کار۔ اس طرح صنعتی میدان میں آلات اور مشینوں کا پورا استعمال نہیں تھا۔ دورانِ جنگ کی مختصر مدت کو چھوڑ کر باقی زمانے میں نہ مشینوں سے زاءد وقت لیا جاتا تھا اور نہ کارخانے ایک شفٹ سے زیادہ چلتے۔

ترقی کی راہ میں بہت سی رکاوٹیں ایسی ہیں جو غریبی کا سبب بھی ہیں اور نتیجہ بھی۔ در حقیقت غریبی ایک ایسا اٹوٹ چکر ہے جس کی وجہ سے کم ترقی یافتہ ملکوں کی معیشت کی نشو و نما کی سطح بلند نہیں ہو پاتی۔ اس کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ مجموعی پیداوار اتنی کم ہوتی ہے کہ خرچ کی ضروریات کے بعد اتنا نہیں بچتا کہ اس سے سرمائے میں کوئی نمایاں اضافہ ممکن ہو۔ ان ملکوں میں حقیقی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے بچت بھی کم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی حقیقی آمدنی کی وجہ سرمائے کی قلت خود حقیقی آمدنی کی کمی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ برطانوی عہد میں صنعتی وسائل کی کمی اور کم پیداآوری دونوں نمایاں تھیں۔ کم ترقی یافتہ ہونا ہندوستان کی امتیازی خصوصیت اور غریبی کے بنیادی چکر کا محور تھی۔ دوسرے دائرے اس بنیادی چکر کو صرف مضبوط کرتے ہیں۔ حقیقی آمدنی کی کمی۔ طلب کی کمی کا سبب بھی ہوتی ہے اور نتیجہ بھی۔ حقیقی آمدنی کم ہونے کی وجہ سے اشیاء کی مانگ کم ہو جاتی ہے۔ برطانوی عہد میں ایک اور اٹوٹ چکر ہمارے کم ترقی یافتہ وسائل کے گرد گھومتا ہے۔ ناخواندگی، مہارت کی کمی، ناواقفیت، عوامل کی بے حرکتی اور برطانوی حکمرانوں کی بے توجہی کی وجہ سے ہمارے وسائل یا تو بے کار رہے یا ان کا پورا پورا استعمال نہیں ہوا، یا غلط استعمال ہوا۔ چنانچہ غیر ترقی یافتہ وسائل ہماری ترقی کی کمی کا سبب اور نتیجہ دونوں بن گئے اور ہم ایک نیم جاگیر دارانہ اور نیم جامد حالت میں پڑے رہے۔(۳)

راشد تیسری دنیا کے گروی رکھے ہوئے لوگوں کی معاشرتی اور سیاسی صورت حال کو بیان کرتا ہے۔ اپنی اجتماعی اور وطنی محرومی کا اظہار وہ یوں کرتے ہیں۔

پارہ نان جویں کے لیے محتاج ہیں ہم
میں، میرے دوست، مرے سینکڑوں اربابِ وطن
یعنی افرنگ کے گلزاروں کے پھول
("شاعر درماندہ")(۴)

راشد کی اپنی سیاسی نظموں میں ظالموں کے ہاتھوں دربدر ہونے والے لوگوں کی درندگی نقشہ بھی کھینچا ہے اور واقعات کے تجزیے کے بعد راشد نے عالمی بساط پر تیسری دنیا کے عوام پر آنے والی ممکنہ صورت حال کو بھی اپنی نظموں میں جگہ دی۔ ہم آج دیکھتے ہیں کہ نو آبادیات نے جس قسم کا نفاق پسماندہ ممالک میں ڈالا، وہ سامراجی عزائم کا روایتی حربہ ہے جہاں تیسری دنیا کے عوام کے خوابوں پر نقب لگائی گئی۔

اب جب کہ اس سائنس اور خلائی دور میں کہا جارہا ہے کہ شاعری کی ضرورت نہیں ہے لیکن راشد کی شاعری اس بات کی نفی کرتی ہے کیونکہ فردیاتی نفسیات کو سمجھنے کے لیے شاعری سے بہتر کوئی اور اظہار کا ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ انسان اعصابی اور معاشرتی تناؤ کو گہرائی سے محسوس کرے تو شاعری انسانی زندگی اور اس سے متعلقہ معاشرتی پہلوؤں کی طاقتور تعبیر بن جاتی ہے کیونکہ تاریخ سے راشد کی شدید قسم کی آگہی نے ماضی کو ایک تکلیف کی صورت میں محسوس کیا لیکن تاریخی حقیقت سے قطعی طور پر فرار حاصل نہ کی بلکہ انھوں نے تاریخ سے اپنا رابطہ ایسا ہی رکھا جیسا کہ ان کا حال سے شدت کے ساتھ جذباتی اور قلبی رشتہ رہا۔ ان کی شعریات میں ماضی کی رمزیات نئے حسی پیکروں کی صورت میں سامنے آکر اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ علامتوں، اشاروں، استعاروں اور تشبیہات کا ظاہری ڈھانچہ آج بھی وہی ہے مگر اس کی معنویت بدل گئی ہے جیسے انھوں نے اپنے یہاں مدائن، کاہن، سلیمان، اسرافیل، یاجوج ماجوج، الوند، کیقباد، بونے آدم زاد جیسی اساطیری علامتیں استعمال کیں۔ یہ اساطیر جہاں تاریخ کے المیات کو ابھارتی ہیں تو دوسری جانب یہ تاریخی استعارے جمالیاتی پیکروں میں فرد کی جذباتی دنیا میں داخل ہو کر جذباتی ارتباط کی لذّتیت اور سنگینی کو ایک ایسے دوہرے تصور میں باندھ دیتی ہے جہاں انسان اپنی عبرت ناکی کا سراغ پاکر ایک انوکھے اظہار کے جمال سے بھی محظوظ ہوتا ہے یوں زندگی کی لایعنیت انسانی فکر کو کشادگی دیتی ہے جو انسانی زندگی کے ایک طویل المناک معاشرتی سفر کے بعد گئے دنوں کو حال کے ساتھ مدغم کرکے حال کو نئے ماضی کی دیواروں کے پیچھے پھینک دیتی ہے۔ جہاں حالِ قریب کے سانحات جذباتی سطح پر ماضی کی دھکتی ہوئی قبر بن جاتے ہیں۔ ان اساطیری علامات سے نہ صرف وہ ماضی کا حال سے جوڑ دیتے ہیں بلکہ ہندوستانی سماج میں ایرانی اور مگر مغربی سماج کا پیوند بھی لگاتے ہیں، اس انداز سے راشد نے دراصل تہذیبوں کے ادغام کی پیش بندی کی تھی۔ قدیم اساطیر کا بیان، علامتی طور پر سمٹتی ہوئی دنیا کی طرف ایک اشارہ ہے۔ "طلسم جاوداں" سے ہم راشد کی تہذیبی بنت سے آشنا ہوتے ہیں۔ راشد کی شاعری اس عالمی گاؤں کی پہلی کرن تھی جس کا سورج پوری آب و تاب سے اکیسویں صدی میں جلوہ ریز ہونا تھا۔

قافلہ بن کر گزرتے ہیں نگہ کے سامنے
مصروہند ونجد وایراں کے اساطیرِ قدیم
کوئی شہنشاہ تاج وتخت لٹواتا ہوا
دشت وصحرا میں کوئی شہزادہ آوارہ کہیں
سرکوئی جانباز کہساروں سے ٹکرتا ہوا
اپنی محبوبہ کی خاطر جان سے جاتا ہوا... (۵)

غلام ہندوستان سے بات شروع ہو کر تیسری دنیا پر سامراجی ریشہ روانیوں اور نو آبادیاتی شکنجے کی مضبوط گرفت تک پھیل جاتی ہے یہاں آکر شاعر کا اعلیٰ دانشورانہ اور فکری اظہار عام انسانوں کی معنویت کا تزکیہ کرتا ہے۔ اپنی نظم "من وسلویٰ" میں وہ اس کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

؎ زمین شرق کے اک کنارے سے دوسرے تک
مرے وطن سے ترے وطن تک
بس ایک ہی عنکبوت کا جال ہے کہ جس میں
ہم ایشیائی اسیر ہو کر تڑپ رہے ہیں(۶)

شاید راشد کو نئے استعماراتی نظام میں تہذیبوں کی شکست وریخت، اور ادغام کا الہام ہو گیا تھا، انھیں اندازہ ہو گیا تھا کہ عالمی استعمار اب نیا روپ بدل کر، نئے کرتب دکھائے گا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اب ایک نئی استعمار کی صورت میں ایک نہایت مہیب اور دیو قامت عفریت کی شکل میں دنیا کے وسائل ہڑپ کرنے کے لیے بیتاب ہے، تیل ہی دنیا کی وسائل کی قیمتی ترین صورت ہے، یہ سیاہ سونا، اب دنیا کو چین کی نیند سونے نہیں دے گا۔ اپنی ایک نظم "تیل کے سوداگر" میں کہتے ہیں:

تیل کے بوڑھے سوداگروں کے لبادے پہن کر،
وہ کل رات یا آج کی رات کی تیرگی میں،
چلے آئیں گے بن کے مہماں
تمہارے گھروں میں،

وہ دعوت کی شب جام و مینا لنڈھائیں گے،
ناچیں گے، گائیں گے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے
وہ گرمائیں گے خونِ محفل!
مگر پو پھٹے گی
تو پلکوں سے کھودو گے خود اپنے مُردوں کی قبریں
بساطِ ضیافت کی خاکستر سوختہ کے کنارے
بہاؤ گے آنسو!
بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو!
گو اب خالہندو کی ارزش نہیں ہے
غدارِ جہاں پر وہ رستا ہوا گہرا ناسور
افرنگ کی آز خون خوار سے بن چکا ہے
بہائے ہیں ہم نے بھی آنسو،
ہماری نگاہوں نے دیکھے ہیں
سیّال سایوں کے مانند گھلتے ہوئے شہر،
گرتے ہوئے بام و در
اور مینار و گنبد،
مگر وقت محراب ہے
اور دشمن اب اس کی خمیدہ کمر سے گذرتا ہوا
اس کے نچلے افق پر لڑھکتا چلا جا رہا ہے!
ہمارے برہنہ و کاہیدہ جسموں نے
وہ قید و بند اور وہ تازیانے سے ہیں
کہ ان سے ہمارا ستمگر
خود اپنے الاؤ میں جلنے لگا ہے!
مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!

مرے ہاتھ میں ہاتھ دے دو!
کہ دیکھی ہیں میں نے
ہمالہ والوند کی چوٹیوں پر انا کی شعاعیں،
نہیں سے وہ خورشید پھوٹے گا آخر
بخاراو سمرقند بھی سالہا سال سے
جس کی حسرت کے دریوزہ گر ہیں(۷)

ان کے یہاں انسانی ماحول سے اکتاہٹ کا عمل نہایت ہی شدت کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ دنیا ان کے لیے کسی دوزخ سے کم نہیں۔ معاشرتی حصار کو توڑ کر وہ کسی کونے میں تنہا بیٹھ کر فکر بھی کرتے ہیں نہایت یکسوئی سے "دیوار جہنم" کے تلے کسی کی "جلوت" کرتے ہیں۔ اپنی نظم "بے چارگی" میں اس کا بیان یوں کرتے ہیں:

میں دیوارِ جہنم تلے
ہر دوپہر، مفرور طالب علم کے مانند
آکر بیٹھتا ہوں اوردزیدہ تماشا
اس کی پر اسرار شوق انگیز جلوت کا
کسی رخنے سے کرتا ہوں!(۸)

راشد کی تقریباً ہر نظم میں مختلف انسانی مصنوعات کی حسیاتی کہانیاں ملتی ہیں۔ وہ بعض تصوراتی اور مشاہداتی واقعات کو شاعرانہ جمالیات کے برش سے رنگتے ہیں۔ لفظیات اور بھرپور قوت اظہار سے ایک بے جان واقعہ میں شدت کی مقناطیسیت اور جاذبیت در آتی ہے۔ جب وہ فرار کی کیفیت کو بیان کرتے ہیں تو ایک انسان کی معاشرتی لاچارگی پر رونا آتا ہے مگر وہ فرار حاصل کرکے وہ تنہائی اس لیے پالینا چاہتے ہیں کہ تنہائی میں ان کے شعری عمل کی خلاقی اور فکری وسعتیں مزید گہری ہو جاتی ہیں جہاں وہ تخلیقیت کی نئی وسعتوں کا سراغ پاتے ہیں۔ فرار اور تنہائی ان کے یہاں قنوطی وظیفہ نہیں بلکہ رجاءیت کا ایک مقام ہے جہاں سے فرد اپنی آرزوؤں، جذبوں اور خود آگہی کے سفر کو نئے سرے سے شروع کرتا ہے، فرد کے جنسی اور شہوانی مسائل ثقافتی وصف کی صورت میں نئے موضوعی تمدن کو تشکیل دیتے ہیں کیونکہ جنس (خاص کر مشرق میں) انسانی ثقافت کا ایک اہم اور پر اسرار مظہر ہے۔ راشد کے تمام جنسی معاملات اس بات کا احساس دلواتے ہیں کہ ثقافت جس کا بہاؤ دریا کی طرح فطری ہوتا ہے لیکن جنس اور اس سے متعلقہ مسائل کو پردہ نشین کرکے جہاں جنسیات کے تصور الجھا دیا گیا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ اس حوالے سے ثقافت بھی مصنوعی ہو گئی ہے اور یوں ثقافت پر بھی انسان شک کرتا ہے کیونکہ

صرف جنسیات ہی نہیں بلکہ ثقافت کے کئی پہلوؤں کو ثقافت صرف اس لیے لوگوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے کہ اگر جنسی معاملات اور دیگر ثقافتی مظاہر کی فرد کو آگہی ہو گئی تو مذہب اور روایت کا ریت سے بنا ہوا اقدار کا محل دھڑام سے گر پڑے گا۔ راشد کا حساس فرد یہاں آکر ایک نئی مغائریت کا شکار ہو جاتا ہے، کیونکہ فرد کا نفسی شعور اس کے اجتماعی شعور کی نفی کرتا ہے۔ راشد کے عہد میں آکر معاشرتی حرکیات اور فعلیات نے اپنے رنگ وروپ کو خود ہی خاصا مسخ کر لیا تھا جو اصل میں کائناتی اخلاقیات میں سالماتی کثرت تھی جو ایک بڑے اور ناگہانی انتشار کا شکار ہوئی اور یہی انتشار ان کی شاعری میں نئی الجھنوں کو جنم دیتا ہے۔ جہاں بیگانگی خلوت گزینی اور فرد دیگر میں اکتاہٹ کا عمل بڑھ کر ماحولیاتی مغائرت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہاں راشد کو داد دینی پڑتی ہے کہ وہ ذہنی الجھنوں اور مغالطعوں میں گھر کر بھی اظہار سے نہیں گھبراتے اور نہ ہی ان کا مخصوص اظہار متاثر ہوتا ہے کیونکہ معاشرے کے روایتی اور پختہ عقائد اور حقائق سے انحراف کر کے وہ تشکیک سے نئی فکری تبدیلی (انحراف) اور واقعیت پسندی سے شعر میں نیا مذاق پیدا کرتے ہوئے ہنگامی اور لمحاتی جذبوں کو اظہار کی نئی فکری جرأت دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اس قسم کی فکری جرأت روایتی معنوں سے قطعی مختلف ہوتی ہے کیونکہ فرد کا پھیلتا ہوا فکری وجدان ذاتی ادراک سے انسانی سانحوں، المیوں اور محرومیوں کو تزکیہ فراہم کرتے ہیں جن کو برت کر قاری عموماً ان کی شاعری میں قریب ترین معنویت پالیتا ہے جو عام انسانی زندگی میں پیچیدگیوں اور تذبذب کا شکار ہوتی ہیں۔" ہمہ اوست "میں وہ لطیف پیرائے میں انسانی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں:

اُسے کھینچ کر جب میں بازار میں لا رہا تھا،
لگاتار کرنے لگا وہ مقولوں میں باتیں:
زباں سیکھنی ہو تو عورت سے سیکھو!
جہاں بھر میں روسی ادب کا نہیں کوئی ثانی!
قفقاز کی حور، مزدور عورت!
جو دنیا کے مزدور سب ایک ہو جائیں!
مرے دوستوں میں بہت اشتراکی ہیں،
جو ہر محبت میں مایوس ہو کر،
یونہی اک نئے دورۂ شادمانی کی حسرت میں
کرتے ہیں دلجوئی اک دوسرے کی،
اور اب ایسی باتوں پہ میں
لب بھی کبھی مسکراتا نہیں ہوں!
اور اُس شام جشنِ عروسی میں

وے ور قص و نغمہ کے طوفان بہتے جا رہے تھے،
فرنگی شرابیں تو عنقا تھیں
لیکن مے ناب قزوین و خُلّارِ شیراز کے دَورِ پیہم سے،
لباسوں سے، ہر خوشبو کی بے باک لہروں سے،
بے ساختہ قہقہوں، ہمہموں سے،
مزامیر کے زیر و بم سے،
وہ ہنگامہ برپا تھا، محسوس ہوتا تھا
طہران کی آخری شب یہی ہے!
اچانک کہا مرسدہ نے:
"تمھارا وہ ساتھی کہاں ہے؟
ابھی ایک صوفے پہ دیکھا تھا میں نے
اُسے سر بزانو!" تو ہم کچھ پریشان سے ہو گ ءے
اور کمرہ بہ کمرہ اُسے ڈھونڈنے مل کے نکلے!
اِک گوشۂ نیم روشن میں
وہ اشتراکی زمیں پر پڑا تھا
اُسے ہم بلایا کیے اور جھنجھوڑا کیے
وہ تو ساکت تھا، جامد تھا!
روسی ادیبوں کی سرچشمہ گاہوں کی اُس کو خبر ہو گئی تھی؟(۹)

راشد کی شاعری اقدار کا تغیر ہے اور یہی رویہ بعض دفعہ پیچیدگی بھی پیدا کر دیتا ہے وہ یوں کہ اظہار کی دانشورانہ روش ان کے اظہار سے ماورا بھی ہو جاتی ہے اور معاشرتی اور فلسفیانہ مظاہر ان کے داخل کی آخری حدود پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں جہاں معروض کی سرحدیں شروع ہوتی ہیں۔ " خلوت میں جلوت "میں اس کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

پھر اِک بار مستی میں جلوت کو خلوت سمجھ کر
بڑی دیر تک رُوبرُو آنے کے
کھڑا جھولتا مُنہ چڑاتا رہا تھا
وہ بلّور کی بے کراں جھیل کے دیو کو گالیاں دے کر ہنّستا رہا تھا،

حَسن اپنی آنکھوں میں رقت کا سیلاب لا کر
زمستان کی اس شام کی تازہ مہمان سے
اُس شہر آشوبِ طہراں سے
کہتا چلا جا رہا تھا:
تُو میری بہن ہے،
تُو میری بہن ہے،
یہ عہدِ سلاطیں کے گزرے ہُوئے
شہسواروں کے عالم کی باتیں!
مگر جب سحر گاہ اُردو میں قرنا ہوئی
ور البرز کی چوٹیوں پر بکھرنے لگی پھر شعاعیں
تو آنکھیں کھُلی رہ گئیں ساتھیوں کی،
حَسن کر رُخ و دست و بازو
خراشوں سے یوں نیلگوں ہو رہے تھے
جیسے وہ جِنوں کے نرغوں میں شب بھر رہا ہو
ہم سب کو جعفر پہ شک تھا
کہ شاید اُسی نے نکالا ہو یہ اپنے بدلے کا پہلُو!
مگر جب حسن اور جعفر نے
دونوں نے
کھائیں کئی بار قسمیں
تو ناچار لب دوختہ ہو گئے ہم
وہاں اب وہ جانِ عجم بھی نہ تھی
جس سے ہم پوچھ سکتے؛
ذرا اور کاوش سے پوچھا حَسن سے
تو بے ساختہ ہنس کر کہنے لگا۔'
'بس، مجھے کیا خبر ہو؟

اگر پوچھنا ہو تو زہر اسے پُوچھو
مری رات بھر کی بہن سے!"(۱۰)

اکیسویں صدی میں انسانی سماج میں بے انتہا تغیر آیا۔ انسانی معاشرہ بھی مشینی ہو تا چلا گیا۔ جذبات، رشتے، تعلق، پڑوس، معاشرہ، سماج وغیرہ کا پاس اور احترام ختم ہو تا گیا۔ اپنی بات، اپنا فیصلہ اور اپنا اقدام صحیح اور بہتر، جب کہ دوسرے کی ہر بات غلط۔ یہیں سے خود پرستی کی ابتدا ہوتی ہے۔ خود پرستی سے فرقہ پرستی، علاقہ پرستی اور مذہب پرستی سماج میں برق رفتاری سے پھیلنے لگتی ہے۔ اکیسویں صدی کی ابتدا کو ابھی محض تیرہ سال کا قلیل عرصہ گزرا ہے۔ لیکن تبدیلی اور تغیر نے اکیسویں صدی کی جو شبیہ پیش کی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ اکیسویں صدی کے اسی عرصے میں سماج میں ایسی ایسی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں جنہیں کم کر کے دیکھنا غیر دانش مندی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ بعض تبدیلیاں تو بیسویں صدی سے ہی وقوع پذیر تھیں۔ یہ سچ ہے لیکن بیسویں صدی کا اواخر ہو یا اکیسویں صدی کا اوائل، سماج تغیر و تبدل کے غیر معمولی دور سے گذر رہا ہے۔ سماج میں در آنے والی ان تبدیلیوں کو ذیل میں بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر جہاں تک سماج کی عکاسی کا ادب سے تعلق ہے تو یہ بات سب جانتے ہیں کہ ادب سماج کا آئینہ ہو تا ہے اور جہاں تک اکیسویں صدی میں شاعری اور خاص طور پر نظم کا معاملہ ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی کی بمشکل تمام ساڑھے تیرہ سال کی مدت میں سماج میں جو تغیرات رونما ہوئے ہیں وہ حیرت انگیز ہیں، لیکن یہی سماجی تغیرات ہمیں جب راشد کی شاعری میں نظر آتے ہیں اور اقدار کا جنازہ اٹھائے فرشتے لیے جا رہے ہیں اور تہذیب کا مُلّائے حزیں کسی کہنہ مسجد کے مینار ساتھ ٹیک لگائے رو رہا ہو تا ہے تو ہمیں خوشگوار حیرت ہوتی ہے کہ شاعر کیسے مستقبل کے دریچے میں جھانک لیتا ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ عظیم الشان صدیقی، افسانہ نگار پریم چند: تنقیدی و سماجی محاکمہ، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ۲۰۰۶ء، ص۹
۲۔ ن۔م۔راشد۔ کلیاتِ راشد، دہلی: کتابی دنیا، ۲۰۱۱ء، ص۲۴۔۲۵
۳۔ ہندوستانی معیشت، الک گھوش، مترجم محمد خلیق، نئی دہلی: نیشنل بک ٹرسٹ، انڈیا، فروری ۱۹۷۴ء، ص۹
۴۔ ن۔م۔راشد۔ کلیاتِ راشد،، ص۹۳
۵۔ ایضاً، ص۶۲۔۶۳
۶۔ ایضاً، ۲۰۱۱ء، ص۱۹۲
۷۔ ایضاً، ص۲۳۵ تا ۲۳۸
۸۔ ایضاً، ص۱۷۵
۹۔ ایضاً، ص۲۱۰ تا ۲۱۶
۱۰۔ ایضاً، ص۲۳۱ تا ۲۳۴

☆☆☆☆☆